ڈاکٹر عقیلہ بشیر

علی گڑھ میں تحقیق غالب کا آغاز اور روایت کی تشکیل

Start of the Research Tradition in Aligarh on "Ghalib"

Abstract:

Dr. Aqeela Jawaid, Associate Professor, Urdu Department, Bahauddin Zakariya University, Multan

This article reflects the tradition of appreciation of Ghalib in Muslim University, Aligarh. This University was setup by Sir Syed Ahmad Khan who was a contemporary writer an intellectual of Mirza Ghalib. Hali who was an active member of circle of Sir Syed Ahmad Khan which now well known as Sir Syed Movement in the history of Urdu Literature.

Muslim University, Aligarh is an institute which adopted this tradition which was started by Hali. Critics like Rasheed Ahmad Siddiqui, Khurshid Ul Islam, Ralph Russle, Aal-e-Ahmad Saroor, Khalil-ur-Rehman Azmi and others contribute much in this regard.

''بڑے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے سماجی، اخلاقی اور سیاسی افکار میں یک گونہ ارتباط اور انضمام کا سراغ لگاتا ہے۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں غالبؔ، دیگر اساتذہ کے برخلاف ایسا اجمالی نظام تشکیل دینے میں کام یاب ہوجاتے ہیں جو نہ صرف روایت کے ہم دم متغیر پہلوؤں کی نشان دہی کرتا رہتا ہے بلکہ روایت کے دائمی عناصر کی تقدیس میں بھی پیش پیش رہتا ہے۔''[۱]

''مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیفِ نثر ہمارا بہت بڑا ورثہ ہیں۔ ادب میں غالبؔ کا شمار ان شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھیں ہم ہر اعتبار سے مشترکہ تہذیب و ثقافت کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں اور ان کا مسلک رنگ و نسل، مذہب و ملّت اور ذات پات کی قید سے آزاد اور بلند ہوکر ساری انسانیت کو ایک رشتہ یگانگت میں منسلک کرتا ہے۔''[۲]

تفہیمِ غالبؔ کی روایت تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ مولانا حالیؔ اور سرسیّد سے لے کر آج کے محقق اور نقاد تک غالبؔ کی شاعری اور نثر کو سمجھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اتفاق سے یہ دو سو سال بالخصوص برصغیر اور بالعموم عالمی سطح پر تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، ایجادات کا سلسلہ نئے علوم کا فروغ، نئے فلسفیانہ نظریات، ادبی نکتہ ہائے نظر، تحریکیں، جنگیں، برصغیر کی تقسیم، غرض بے شمار واقعات ایسے ہیں جو زندگی اور متعلقاتِ زندگی کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں۔ نیز ان حالات میں ایک شاعر کی فکر کا نہ صرف زندہ رہنا بلکہ عصری تقاضوں کے مطابق معنی کی ترسیل ایک ایسا معجزہ ہے جو اُردو شاعری میں غالبؔ کو ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی شاعری تروتازہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مضمون ''تفہیمِ غالبؔ کی عظمت اکیسویں صدی میں'' لکھا ہے:

> ''تفہیمِ غالبؔ ہر دور کا مسئلہ رہا ہے۔ غالبؔ کی عظمت اس میں مضمر ہے کہ وہ ہر زمانے کی فکری اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کرتا چلا آیا ہے۔ وہ زندگی کی مرکب صورتوں کا ترجمان ہے۔ پے چیدہ تجربات اور نرم و نازک احساسات کا بیان پے چیدہ صورتوں کا متقاضی رہا ہے۔ ہر دور نے غالبؔ کی پہچان اپنے عصری رجحانات کے حوالے سے کی ہے اس لئے غالبؔ مشکل پسندی کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔''[۳]

غالبؔ نے جس معاشرے میں جنم لیا تھا وہ ژولیدگی کے بھیانک جمود میں گرفتار تھا۔ وہ تبدیلی کے خوگر تھے۔ غالبؔ، برصغیر میں انقلاب کے اولین داعیوں میں سے تھے۔ وہ انقلاب جس کے ایک طرف شاہ عبدالعزیزؒ ہیں اور دوسری طرف سرسیّد احمد خان

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشہ غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہونا

سرسیّد احمد خان کا بیان دیکھئے:

> ''وقت اور اس کی روح سائنسی علوم اور اس کے نتائج سب تبدیل ہوگئے ہیں۔ مسلم دانش وروں کی قدیم تصنیفات مسلمانوں کو حریتِ فکر اور سادگی کی تعلیم دینے میں ناکام رہی ہیں اور نہ ہی وہ عمومی طور پر حقوق کے حصول میں معاونت کرتی ہیں۔ یہ کتابیں احساسِ غلامی کا نفاذ کرتی ہیں اور عام لوگوں کو غرور، تکبر، غیر حقیقت پسندی اور خود فریبی میں مبتلا کرتی ہیں۔''[۴]

سرسیّد کا مندرجہ بالا بیان اور غالبؔ کی کوک ایک ہی طرح کا درد اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو، ایک نقشِ پا پایا

سرسیّد کے مندرجہ بالا بیان مسلمانوں کو وقت کے ساتھ اپنی زندگی، اپنی محنت اور اپنے خیالات کو حرکتِ عمل، جستجو اور عقلی ترقی و مقصدی زندگی کے مطابق ڈھالنے کا اشارہ کر رہے ہیں اور غالبؔ جیسا عظیم شاعر اپنی مثنوی میں یہ پیغام یوں دیتا ہے کہ:

صاحبانِ انگلستان رانگر
شیوہ و اندازِ ایناں رانگر
آتشے کز سنگ بیروں آورند
ایں ہنر منداں زخس چوں آورند
تاچہ افسوں خواندہ اندایناں برآب
دود کشتے راہمی راند در آب
من کہ آئینِ ریارا دشمنم
در وفا اندازہ دان خود منم

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم انگلستان کی طرف دیکھو وہ کیسی کیسی ترقی کر رہے ہیں انھوں نے اپنے ہنر سے کیسی کیسی نایاب اشیاء تخلیق کی ہیں۔ وہ سمندر کی لہروں پر کشتی اور جہاز چلا رہے ہیں۔ غالبؔ اس وقت یہ جان گئے تھے کہ پس ماندہ مسلمان کیسے دوبارہ سے ترقی کر سکتے ہیں اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ نئے ادب، نئی سوچ، نئی تخلیقات کی اہمیت کو وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہی بات اقبال نے اپنے بیٹے جاوید کو نظم ''جاوید کے نام'' میں کہی کہ اپنے زورِ بازو سے اپنی ذہنی تخلیق سے اپنی دنیا آباد کرو اور اپنے رہنے کا سامان کرو۔

انیسویں صدی کا ہندوستان اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لحاظ سے سترہویں اور اٹھارویں صدی کا زائیدہ تھا، لیکن ہر زمانی تسلسل کی طرح نہ تو خالص ارتقائی، نہ خطِ مستقیم کی طرح سیدھا۔ روایتوں کی سخت جانی، تہذیبی اثرات کے اختلاط، معاشی تغیرات اور سیاسی حالات نے اسے پیچیدہ، مرکب اور متضاد عناصر پیدا کر دیئے تھے کہ تصورات اور اقدار کے نئے نئے حلقے بن گئے جو زوال پذیر معاشی حدوں کے اندر اپنے پجاری رکھتے

تھے۔ یہ ہل چل اور اضطراب، سنئے اور بگڑنے کی یہ جدو جہد اور کشمکش نہ بے معنی تھی اور نہ اتفاقی بلکہ اس کے اندر مرنے اور پیدا ہونے کا کرب تھا۔ کسی سانچے میں ڈھل جانے کی بے چینی تھی۔ بگاڑنے کا غم اور خوف اور بنانے کا احساس اور ولولہ تھا اور یہ سب کچھ صدیوں کے کچلے ہوئے ارمانوں اور خوابوں، مشرق و مغرب کے تصادم سے پیدا ہونے والے تاریخی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس حرکت اور ذوقِ نمود کی ایک شکل وہ تحریک تھی جو ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ یہ تحریک ہندوستان کے ایک عام دورِ بیداری کا ایک جزو تھی جسے کبھی کبھی نشاۃ الثانیہ کہا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ گیری اور نئے شعوری اثرات اور مطالبات کے لحاظ سے یہ دور تغیر ہندوستان کی کسی اور تحریک سے مماثلت نہیں رکھتا تھا بلکہ اگر کہہ سکیں تو ''نشاۃِ اولین'' تھا جسے عام گفتگو میں ''دورِ جدید'' کہتے ہیں۔ اب اگر ہم علی گڑھ تحریک کو ایک بڑی تحریک کا جزو قرار دیتے ہیں تو منطقی زبان میں گفتگو کرنے کے لئے ہمیں ''کل'' کی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ تحریک کے ہر پہلو پر نگاہ جاسکے۔۵

سرسیّد کی شخصیت اور تحریک نزاعی تھی، آج سے ایک صدی قبل بھی اور آج بھی۔ وہ اپنے عہد کا ردِعمل بھی تھی اور مستقبل کے لیے اشاریہ بھی۔ اس لئے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کی حزیمت اور برطانوی تسلط پر منتج ہوئی۔ مسلمانوں کو اس انقلاب میں جان و مال، عزت و ناموس ہی کی قربانیاں نہ دینی پڑیں بلکہ اس سفید سامراج کے روپ میں قدیم تہذیب اور اسلامی تمدن کی موت بھی نظر آرہی تھی۔ اس پُرآشوب عہد میں جب کہ مسلمان آبادی کا کثیر حصہ احساسِ شکست کی بنا پر دروں بینی انفعالیت اور قومی سطح پر احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ معاشرہ، گدلے پانی ایسے جوہڑ کی صورت اختیار کرگیا۔ سرسیّد تحریک اس گدلے پانی کے لیے ایسا پتھر ثابت ہوئی جس سے لہروں کے بننے والے دائرے پھیلتے ہی گئے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب آنے والے حالات کا بہت بڑا پیش خیمہ تھا۔ سرسیّد احمد خان نے محسوس کیا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا مل جل کر رہنا ناممکن ہے۔ چناں چہ سرسیّد احمد خان اور اُن کے رفقاء کار کی جہدِ مسلسل سے تعلیمی، سیاسی اور ادبی میدان تسخیر ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے حالات بدلنے کا حل تعلیم میں تلاش کیا اور کئی مخالفتوں کے باوجود علی گڑھ میں جس درس گاہ کی بنیاد رکھی وہ ہندوستان میں ایک نیا تعلیمی تجربہ ثابت ہوئی۔٦

علی گڑھ تحریک کا باقاعدہ آغاز سرسیّد احمد خان کی انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۸۷۰ء میں ہوا مگر اس کے اثرات پہلے سے محسوس کیے جارہے تھے۔ خصوصاً اس وقت جب سرسیّد غازی پور میں تعینات تھے۔ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ ان کا اقتدار ہندوستان میں روز بروز مستحکم ہوتا جائے اور ہندوستانیوں میں خوئے غلامی اس قدر پختہ ہوتا جائے کہ وہ انگریزوں کے جانثار غلام بن جائیں اور بہت سے اقتدار پسند انگریز ہندوستانیوں کو برائے نام تعلیم بھی نہیں دینا چاہتے تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے ان میں بے داری کی لہر دوڑ جائے گی اور انگریزوں نے چوں کہ اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا لہٰذا ادبی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، تعلیمی ہر لحاظ سے مسلمانوں کو پیچھے رکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت سرسیّد احمد خان واحد شخص تھے جنھوں نے مسلمانوں کی ترقی کا حل علوم سے فیض یاب ہونے میں تلاش کیا۔ سرسیّد احمد خان کی تعلیمی تحریک آفتابِ تازہ بن کر ہندوستان کے بطن سے نمودار ہوئی اور جس کی شعاعوں سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ منور ہوگیا۔

شورشِ عندلیب نے روح چمک میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

سرسیّد کی معروف تصانیف سے ان کی وسیع علمی دلچسپیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''آثارالصنادید'' (۱۸۴۷ء) جس میں دہلی کی مشہور شخصیات، قدیم تاریخی عمارات اور مشہور مقامات کا حال رقم ہے۔ یہ قدیم انداز میں مقفّیٰ عبارت میں تھی لیکن بعد میں (۱۸۵۴ء) خیالات میں تبدیلی کی بنا پر اسے سلیس اُردو میں لکھا۔ اس کا انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ ''آئینِ اکبری'' اور ''تاریخِ فیروز شاہی'' (۱۸۹۲ء) کی تصحیح کی اور حواشی لکھے جس کے انگریز مورخین بھی معترف ہیں۔ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' (۱۸۵۹ء کے ہنگامہ کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور ''وفادار مسلمانانِ ہند'' میں ان مسلمانوں کے کارنامے گنوائے گئے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ ہر دور کا مقصد انگریزوں کے دلوں سے مسلمانوں کے بارے میں شکوک وشبہات اور نفرت کو ختم کرنا تھا۔ ''تبیین الکلام'' بائبل کی تفسیر ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی شروع کی اور چھ جلدوں میں نصف قرآن تک پہنچے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی۔ یہ تفسیر اس سے قبل شایع ہونے والے رسالہ ''احکام طعام یا اہل کتاب'' (۱۸۶۸ء) میں انھوں نے اسلامی شعائر کا عملی نکتہ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے بہت سی غلط باتوں کو مسترد کیا اور

بہت سے امور عقلی استدلال کیا اور کافر، ملحد، بے دین اور نیچری کہلائے حالاں کہ انھوں نے ''خطباتِ احمدیہ'' میں سر ولیم میور کی مشہور کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں کیے گئے اعتراضات کا بڑا کام یاب اور مدلل جواب دیا۔ ''کیمیائے سعادت'' (۱۸۵۳ء) کا ترجمہ کیا اس کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی کئی کتابیں ہیں اور ان کے مقالات کا تو شمار ہی نہیں جو انھوں نے مختلف مذہبی، تعلیمی، قومی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر لکھے اور جو ''تہذیب الاخلاق'' میں چھپے۔ ے

انگلستان میں قیام کے دوران وہ ''سپیکٹیٹر'' اور ''ٹیٹلر'' سے بہت متاثر تھے۔ یہ رسالے انگریزی معاشرے کی خرابیوں پر ہلکے پھلکے انداز میں طنز کرتے تھے۔ سرسیّد احمد خان بھی چوں کہ اصلاحِ معاشرہ کا جذبہ رکھتے تھے لہٰذا انھوں نے وطن واپسی پر اسی طرح کا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس نے ''سپیکٹیٹر'' اور ''ٹیٹلر'' سے زیادہ کام کیا۔

سرسیّد نے مسلمانوں کی بقاء اور ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ سرسیّد کی تحریک جو سماجی، اخلاقی، علمی اور معاشرتی بھی تھی بہت کام یاب رہی۔ ان کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں کئی جان نثار مل گئے تھے جن میں حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک او رسروقار الملک کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ انھی کوششوں سے یہ تحریک عروج پکڑ گئی اور اس کا اثر پورے معاشرے پر پڑا۔ لوگ نئے انداز سے سوچنے لگے، معاشی، فلسفیانہ، تاریخی، سیاسی اور اخلاقی غرض ہر موضوع پر خیالات کا اظہار ہونے لگا۔ اس طرح ادب میں نئے موضوعات کے ساتھ نیا اُسلوب بھی سامنے آیا۔

اس تحریک کو جاری رکھنے کے لئے سرسیّد اور اُن کے ساتھیوں نے بے شمار قربانیاں دیں۔ سائنسی علوم کی تدریس کے باعث ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لوگ سرسیّد کے خلاف ہوگئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس ہنگامے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

> ''سرسیّد کے خیالات نے ملک بھر میں آگ لگا دی چناں چہ اس تحریک کے خلاف ردِعمل بھی کوئی کم شدید نہ ہوا۔ انفرادی، احتجاجی اور کٹ ملاؤں کی تکفیر سے قطع نظر اودھ پنچ کی صورت میں اچھا خاصا متحدہ محاذ قائم تھا بلکہ سرسیّد کے ساتھ ساتھ حالی بھی نہ بخشے گئے کیوں کہ اِن کے لیے ایک علیحدہ کالم مخصوص تھا جس کی تنقید کا اندازہ سرنامہ کے اس شعر سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔
>
> ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
> میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

لیکن بعد ازاں سرسیّد کی مساعی کے اکبر الہ آبادی خود بھی قائل ہو گئے تھے کیونکہ لکھا ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا ہے
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے اور کرنے والے میں

بقول نیاز فتح پوری:

"سرسیّد کی شخصیت کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ اہل علم و ادب اور اکابر قوم کے کس طبقہ میں انھیں جگہ دی جائے آسان نہیں اِن میں بیک وقت اتنی متعدد اہلیتیں مجتمع ہوگئی تھیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے لیکن جس حد تک اِن کی آئیڈیالوجی کا تعلق ہے ہم بلا پس و پیش کہہ سکتے ہیں کہ وہ ریفارمر یا مصلح تھے اُن کی زندگی کا مقصد صرف اصلاح قوم تھا۔"[9]

سرسیّد احمد خان سے پہلے اُردو ادبیات کا دائرہ مذہب، تصوف اور تاریخ تک محدود تھا اور علوم طبعی کا مذاق بہت کم تھا اگرچہ شاعری کے موضوعات میں نسبتاً کشادگی اور رنگارنگی موجود تھی۔ سرسیّد احمد خان نے انسان کی اجتماعی زندگی کے عقلی تصور اور اس سے متعلق مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اُردو ادب نے سرسیّد احمد خان کے زمانے میں پہلی دفعہ مادی دنیا میں آنکھ کھولی اور عقلی معیاروں کی روشنی میں خود کو سمجھنے کی کوشش کی اور پرانے ادب کے برعکس (جو ذوق اشتہائی تسکین اور زبان و بیان کے لیے شستہ اسالیب مہیا کرنے پر کاربند تھا، جس کی حیثیت بالعموم تفریحی، ذوقی اور تربیتی تھی) نئے ادب کا تصور دیا جس نے زندگی اور اس کی عام ضرورتوں کو معاشی اور معاشرتی روابط، عقل و دانش کی برتری بلکہ ہمہ گیر نوعیت کو پیشِ نظر رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کے پرور دو ادب میں انسان اور کائنات کے مابین رابطہ سمجھنے اور اس کی عقلی تعبیر کرنے کے کام کا آغاز ہوا اور ان رشتوں کی جستجو کی گئی جن کے ذریعے انسان اور کائنات کے روابط کو زندگی کی تشکیل کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

محسن الملک کے بقول:

"۱۸۵۷ء کے غدر میں مرحوم نے جس قومی خیر خواہی کے ارگن کو کوکا، دمواپیں تک ان کی آواز منقطع نہ ہوئی اور ایک سے ایک بڑھ کر نغمہ دل کش اس سے نکلتا چلا آیا۔ جہاں جہاں وہ سرکاری خدمات کے تعلق سے رہے، ان کے آثار حمیدہ مدرسے اور سوسائٹیاں وغیرہ موجود ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ ایک قومی خیر خواہ اور ایک قومی ریفارمر نے اُن کے بنیاد ڈالی ہے مگر سب سے بڑا اور بہت بڑا احسان

جوانھوں نے قوم پر کیا، ملک پر کیا، سرکار پر کیا جو موجود ہیں اور اُن پر کیا، جو آگے کو پیدا ہوں گے۔ وہ علی گڑھ کالج کا جاری کرنا تھا۔ انھی کا فکر صحیح وصائب کہ اُس نے ایسے کالج کی ضرورت کو سمجھا اور انھی کی ہمت تھی بلند و وسیع کہ اس کے بنانے اور جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اور انھی کا استقلال تھا متین و مستحکم کہ جو سوچا تھا اور جس کا ارادہ کیا تھا اس کو کر دکھایا۔" ۱۰

تحریک علی گڑھ سے اُردو ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا اور اس کے اسالیب بیان اور روح و معانی میں خاطر خواہ تبدیلی واقع ہوئی اِس کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کے موضوعات کا دائرہ بھی وسیع ہوا اور ہر صنفِ ادب میں ترقی کے نئے راستوں کا اجرا ہوا۔ سرسیّد دور میں ادب کا رشتہ زندگی سے استوار ہوا۔ سرسیّد اور ان کے نام ور رفقاء کی بدولت علی گڑھ میں ایسا ادب تخلیق ہوا جو استدلالی، منطقی اور مقصدی تحریکات کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل و حل کا بیان اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ ناول نگاری، سوانح نگاری، تاریخ نگاری غرض شعر و شاعری کا رشتہ زندگی سے جڑتا ہوا محسوس ہوا۔

اس سلسلے کی پہلی آواز یقیناً غالبؔ کی ہے جنھوں نے برصغیر کے پُر آشوب زمانے کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ بجائے خود بھی اس کا حصہ رہے۔

غالبؔ کے سامنے ایک طویل ڈرامے کا آخری سین کھیلا جا رہا تھا۔ یہ سین اصول طور پر ۱۸۰۳ء میں ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہ سین ۱۸۵۷ء تک گھسیٹا جاتا رہا۔ غالبؔ اپنی جوانی کے دنوں میں ہی مسلم اقتدار کی ضعیفی کے قائل ہو چکے تھے۔ غالبؔ حقیقت پسند فلسفی شاعر تھے وہ قوم کے زوال کے صحیح شناور تھے اور جانتے تھے کہ مسلمانانِ ہندوستان "دانش امروز" کنارہ کش ہو کر گھپ اندھیرے مین ٹامک ٹولیاں مارنے پر مجبور تھے۔ غالبؔ اپنی قوم کی فکری پسماندگی پر ملول رہتے تھے۔ غالبؔ اس خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ انگریز چند ماہ یا دنوں کا مہمان ہے۔ وہ انگریزوں کی صنعتی ترقی پر حیران تھے اور جان گئے تھے کہ انگریز عمل داری کلکتے سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ مشرق و مغرب اور جنوب کی سمتوں سے دہلی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسی لیے غالبؔ اپنے کلام میں جگہ جگہ علم کی اہمیت کے بارے میں حقیقت پسندانہ نکتہ نظر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ نے انیسویں صدی کے نصفِ اول کے ہندوستان میں فن کی سطح پر وہی کام کیا ہے جو امریکی فلسفی PEARCE نے سائنس و ٹیکنالوجی کی حق میں انجام دیا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غالبؔ اس

فلسفیانہ فکر کے داعی تھے۔ جسے پیرس PEARCE نے چار چاند لگائے۔ غالبؔ اُس فکری نشاۃ الثانیہ کے اہم رہنماؤں میں سے ایک ہیں، جس نے خوابیدہ برصغیر کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا تھا۔ سرسیّد تحریک کا سلسلہ لامحالہ غالبؔ سے جاملتا ہے کیا یہ امر محض اتفاقی ہے کہ غالبؔ نے کلیاتِ فارسی کی مثنوی دہم میں جس بالغ نظر کا اظہار کیا تھا وہ سرسیّد احمد خان کے اس بیان سے بہت زیادہ مختلف نہیں جو مسلمانانِ ہند کی تعلیمی ترقی سے متعلق کمیشن (۱۸۷۲ء) کے سامنے دیا گیا تھا۔!!

غالبؔ ایک ایسی قدآور شخصیت ہیں جو اپنے ہم عصروں میں منفرد ہیں۔ جن کے ہاں حسن و عشق کے موضوعات سے لے کر حیات و کائنات کے اسرار تک کی تفہیم نظر آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے ہاں مختلف رنگوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اِن کے ہاں موضوعات کے تنوع اور خیالات کی ندرت اور عظمت نے ایسا سحر تخلیق کیا ہے کہ ناقدین ان کے دیوان کو الہامی کتاب کا درجہ دیتے ہیں۔

غالبؔ نے جس طرح غزل میں موضوع، خیال و بیان کی نیرنگی کو پیش کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روایت پر چلتے ہوئے نئی راہوں کو تلاش کرتے ہیں۔ غالبؔ کی شخصیت، غالبؔ کی شاعری کے رنگ ہر طرح کے تعصب سے پاک ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ان کی شاعری کو مقبولیت ملی اور ان کی شاعری آج بھی تر و تازہ ہے اور ہر قاری کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

غالبؔ ایسے ہمہ صفت شاعر ہیں جنھوں نے عصری تقاضوں اور پیچیدگیوں کو نہ صرف سمجھا بلکہ اپنی شوخی، سیماب صفتی اور حرکت پسندی کے نئے نئے موضوعات کو جنم دیا۔ نئے موضوعات کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ وہ روایت سے بھی ناطہ نہیں توڑتے ایک بڑے شاعر کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ روایت پر چلتے ہوئے اس میں تجربے کے امتزاج سے وسعت پیدا کرے۔ اس اعتبار سے بلاشبہ غالبؔ عظیم شاعر ہیں۔

غالبؔ کی شخصیت اور فن پر لکھنے کا کام تقریباً ہر علاقے اور ہر ادبی مرکز میں ہوا ہے۔ ان مراکز کی اپنی اک الگ شناخت اور حوالہ ہے ان میں ایک ادارہ علی گڑھ ہے جو اپنے طور پر خرد افروزی اور روشن خیالی کا استعارہ ہے۔ اُردو ادب میں علی گڑھ اور اس کے اثرات کو آج کے عصری ادب پر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اُردو میں ادب برائے زندگی، مقصدیت،

اصلاح اور عصری شعور ایسے مباحث کو علی گڑھ تحریک نے اٹھایا اور اُسے اپنے فکری میلان ورجحانات کا حصہ بنایا۔ علی گڑھ تحریک نے فرسودہ موضوعات، اسالیب اور نظریات کو رد کرتے ہوئے نئے فکری افق سے اُردو ادب کو آشنا کیا نیز استدلالیت اور منطقیت پر مبنی نئے اسلوب کی طرح بھی علی گڑھ تحریک کا حاصل ہے۔ اس کے علاوہ غالبیات کے حوالے سے معیار اور مقدار کے حوالے سے بہت اہم کام ہوا ہے۔ غالبؔ کے اُردو اور فارسی دواوین، خطوط، دیگر کتب کے علاوہ غالبؔ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تحقیق وتنقید کے شعبوں میں نہایت وقیع کام ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم یونیورسٹی میں بھی غالبؔ کے حوالے سے تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ نیز رسائل کے غالبؔ نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ علی گڑھ میں غالبؔ پر اس قدر کام ہوا ہے اور ہورہا ہے کہ اپنے طور پر یہ ایک دبستان کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ علی گڑھ میں غالبؔ پر ہونے والے تحقیقی کام کا تجزیہ اپنے طور پر اہمیت رکھتا ہے تاکہ اس روایت کا تعین ہوسکے اس سارے عمل میں علی گڑھ میں تحقیقی غالبؔ کے آغاز اور پھر روایت کی تشکیل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علی گڑھ کا تعارف وجغرافیائی حالات کا مختصر انداز میں جائزہ لینا ضروری ہے کہ جس دیار میں غالبؔ مشکل پسند ہونے کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔

انسان جس خطے کو اپنا مسکن بنالیتا ہے وہاں اپنی روزمرہ زندگی کی ضروریات کا انتظام بھی کرتا ہے اور یوں ضرورت وآبادی میں اضافہ کے باعث اُس خطے کے طول وعرض میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس خطے کی آب وہوا، رہن سہن، عادات و اطوار میں تبدیلی و ترقی آنا شروع ہوجاتی ہے نئے علوم کو فروغ ملتا ہے۔ لوگوں کے وژن (vision) میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر اس علاقے یا خطے کا نام بھی مخصوص ہوجاتا ہے۔

یہی صورت حال ''علی گڑھ'' کے ساتھ رہی ہے۔ ''علی گڑھ'' کا ابتدائی نام جو آج بھی لوگوں کی زبان پر رہتا ہے ''کول'' تھا۔ جو کہ دہلی اور اکبرآباد کے درمیان قدیم شہر ہے۔ اکبرآباد میں غالبؔ پیدا ہوئے اور رہائش دہلی میں اختیار کی اور دیارِ دہلی ہی مدفن بنا۔ ''علی گڑھ'' (کول) ایک قدیم شہر ہے۔ اس شہر کو مغلیہ عہدِ حکومت میں حکمران بابر کے ایک ماتحت جنگ نے فتح کیا۔ اس وقت سے یہ شہر ''علی گڑھ'' کے نام سے موسوم ہوا تھا۔[۱۲] ''علی گڑھ'' کے نام سے موسوم ہونے کے بعد بھی اس علاقے کو جو کہ قصبہ نما شہر تھا عرصہ دراز تک ''کول'' کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ غالبؔ کے دور میں بھی علی گڑھ کا پرانا نام ''کول'' زیادہ تر سنا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غالبؔ نے خود بھی اس شہر کو ان دونوں ناموں (کول، علی گڑھ) سے یاد رکھا ہے۔

غالبؔ نے اپنے متعدد اردو خطوط جو انھوں نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھے تھے اِس شہر کو ''علی گڑھ'' اور ''کول'' دونوں ناموں سے یاد کیا ہے۔ ۱۳؎ غالبؔ کا مولد اکبر آباد اور مسکن و مدفن دہلی سے علی گڑھ کے محلِ وقوع کی قربت کو سب سے پہلے رشید احمد صدیقی نے محسوس کیا تھا اور چھے صفحات پر مبنی اپنے مضمون ''غالبؔ اور علی گڑھ'' میں واضح انداز میں اہلِ علم کی توجہ مبذول کرائی۔ ۱۴؎ میرے اندر تحقیقِ غالبؔ میں علی گڑھ کی خدمات پر کام کرنے کی تحریک اس وقت پیدا ہوئی جب حال ہی میں، میں نے ڈان اخبار میں محمد علی صدیقی کا مضمون ''غالبؔ اور علی گڑھ'' پڑھا تھا۔ ۱۵؎ اس مضمون کا پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس موضوع کو باقاعدہ طور پر سمیٹنے اور اس روایت کا تعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تفہیم غالبؔ کی روایت میں علی گڑھ کی ادبی خدمات کا اس طرح جائزہ لیا جائے کہ ایک مربوط روایت قائم ہو سکے یوں تو تفہیم پر بہت سا کام ہوا ہے مگر اس روایت کا تعین نہیں ہو سکا۔

سرسیّد تحریک کا مرکز ''علی گڑھ'' تھا۔ علی گڑھ تحریک کے بانی سرسیّد احمد خان کی نابغہ روزگار شخصیت غالبؔ کے ساتھ وابستگی اور جن رشتوں کا سراغ ملتا ہے یہ ایک دل چسپ ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر سب سے پہلے غالبؔ اور سرسیّد کے تعلق کی وضاحت ضروری ہے۔

غالبؔ اور سرسیّد کے صحیفہ حیات کے مطالعے سے ایک دل چسپ اور عجیب اتفاق ہمارے سامنے آتا ہے کہ جس طرح سرسیّد احمد خان کا مولد دہلی تھا اور یہ غالبؔ کا مسکن رہا۔ اسی طرح غالبؔ کا مولد آگرہ تھا اور یہ شہر کچھ عرصہ تک سرسیّد کا مسکن بھی رہا ہے۔ ان دونوں ہم عصر مشاہیر میں سے ایک کا مولد دوسرے کا مسکن رہا ہے۔ پہلی نسبت سرسیّد اور غالبؔ کی ایک دوسرے کے ساتھ ان علاقوں کی ہے جہاں وہ پیدا ہوئے اور رہائش رکھی۔ دونوں ہی کسی نہ کسی طرح ان علاقوں سے وابستہ رہے۔ دوسرا دلچسپ سراغ جو غالبؔ اور سرسیّد احمد خان کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتا ہے وہ پینشن کے حوالے سے ہے کہ پینشن کا مقدمہ غالبؔ کی زندگی کا اہم معرکہ رہا ہے جس کے باعث زندگی کے ماہ و سال صرف ہوئے اور بنارس کا سفر بھی اختیار کیا نتیجہ بالآخر ناکامی کے سوا کچھ نا پایا۔ تنخواہ اور پینشن میں غالبؔ اور سرسیّد میں یہ قدر مشترک رہی کہ غالبؔ انگریزی سرکار سے پینشن اور مغل دربار سے تنخواہ پایا کرتے تھے۔ سرسیّد احمد خان کو مغل دربار سے خاندانی پینشن اور انگریزی سرکار سے تنخواہ ملتی تھی (۱۶)۔

غالبؔ اور سرسیّد میں دوستانہ روابط، باہمی شناسائی اور قربت تو نہ رہی کیوں کہ دونوں کی عمروں میں بیس برس کا تفاوت تھا ہاں ایک ہی دیار میں رہتے ہوئے قربت اور وابستگی کا یک تعلق ضرور بنتا ہے (۱۷)۔ مرزا غالبؔ متولد ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء، سرسیّد احمد خان (ولادت ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء) سے عمر میں کم و بیش ۲۰ سال بڑے تھے۔ غالبؔ اپنی شادی (۱۷ رجب ۱۲۲۵ھ بمطابق شنبہ ۱۸/ اگست ۱۸۱۰ء) کے دو تین سال بعد تقریباً ۱۳ سال کی عمر میں ۱۸۱۲ء میں اپنے مولد اکبر آباد کو خیر باد کہہ کر دہلی منتقل ہوئے اور غالبؔ کے ورودِ دہلی کے چار پانچ سال بعد سرسیّد احمد خان کی ولادت ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی تھی (۱۸)۔ سرسیّد غالبؔ کو چچا کہتے تھے اور جن عالموں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے ان میں غالبؔ بھی شامل ہیں۔ مولانا حالی نے ''حیاتِ جاوید'' میں اس بات کو واضح الفاظ میں لکھا ہے۔ (۱۹)

فروری ۱۸۳۹ء سے سرسیّد احمد خان اپنی ملازمت کے سلسلے میں دہلی سے باہر رہتے تھے تاہم انہیں غالبؔ سے ملاقات کے مواقع نہ مل سکے (۲۰)۔ تاہم غالبؔ اور سرسیّد کے ادبی آثار میں کئی ایسے واقعات موجود ہیں جن سے ان دونوں ہم عصروں میں تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان دونوں ہم عصروں میں ۱۸۵۵ء کے آس پاس کشیدگی کا سبب ''آئینِ اکبری'' پر غالبؔ کی وہ تقریظ ہے جن میں غالبؔ نے اس تخلیق پر اعتراض کیا۔ مولانا حالی کے الفاظ میں:

> ''مرزا غالبؔ کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے وہ کلیاتِ غالبؔ میں موجود ہے مگر ''آئینِ اکبری'' میں سرسیّد نے اُسے قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ابوالفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اس کی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے چناں چہ کہتے ہیں۔
>
> مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب
> یافت از اقبا سیّد فتح یاب
> دیدہ بینا آمد باز و قوی
> کہنگی پوشید تشریف نوی
> ویں کہ در تصحیح آئیں رائے اوست
> ننگ و عارِ ہمت والائے اوست
>
> ـــــ جب یہ تقریظ مرزا نے سرسیّد کو بھیجی انھوں نے اس کو مرزا کے پاس واپس بھیج دیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں''۔ (۲۱)

یہ کشیدگی ۱۸۵۵ء میں شروع ہوئی۔ سرسیّد احمد خان اور غالبؔ کے درمیان تعلقات کی خوش گوار فضا دوبارہ اس وقت پیدا ہوئی ہے جب سرسیّد مراد آباد میں تھے اس وقت غالبؔ نواب یوسف علی خاں (مرحوم) سے ملنے رام پور گئے اور واپسی پر سرسیّد احمد خان کے سرائے میں قیام کیا۔ حالیؔ ''حیاتِ جاوید'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''سرسیّد کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خان (مرحوم) سے ملنے رامپور گئے تھے ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی۔ مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں آکر ٹھہرے ہیں میں تو فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا۔ ظاہر ہے جب سے سرسیّد نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامن گیر ہوگیا تھا اور اس لیے مرزا نے مراد آباد میں آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سرسیّد کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسیّد نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سرسیّد نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے۔ مرزا نے کہا بھئی مجھے دکھا تو دو تم نے کہاں رکھی ہے انھوں نے کوٹھری میں لے جاکر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ کس نے پی ہے شاید اس لئے تم نے اٹھا کر کوٹھری میں رکھ دی تھی ___ سرسیّد ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آرہی تھی رفع ہوگئی۔'' (۲۲)

مرزا غالبؔ کا اُردو دیوان پہلی بار سرسیّد احمد خان کے بڑے بھائی سیّد محمد خان کے مطبع واقع دہلی سے شعبان ۱۲۵۷ھ بمطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ (۲۳)

رشید احمد صدیقی اپنے مضمون ''غالبؔ اور علی گڑھ'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

''غالبؔ کا اُردو دیوان سب سے پہلے سرسیّد کے بھائی سیّد محمد خان بہادر مالک مطبع سیّد المطابع وسیّد الاخبار نے ۱۸۴۱ء میں اپنے مطبع سے شائع کیا سرسیّد کی کتاب ''آثار الصنادید'' ۴۷۔۱۸۴۶ء سب سے پہلی کتاب ہے جس میں غالبؔ کے حالات وکلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے اس کتاب کا باب چہارم جس میں دلی کے

نامور مشائخ، علماء وفقرا، اطباء اور شعراء وغیرہ کا ذکر ہے۔ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ تقریباً سب لوگ ایسے ہیں جن سے سرسید متعارف تھے۔ ان میں مرزا غالب کا تذکرہ شعراء کے ضمن میں سب سے پہلے کیا گیا ہے جو سترہ صفحات پر پھیلا ہوا۔"[۲۴]

''حیاتِ غالب'' سے ہی علی گڑھ کو غالب کے کلام و شخصیت سے عقیدت رہی ہے۔[۲۵] سرسیّد کی کتاب ''آثار الصنادید'' کے ۱۸۴۷ء کے لئے ایڈیشن کے چوتھے باب میں ''ذکر بلبل نوایان سواد جنت آباد حضرت شاہ جہاں آباد'' کے عنوان سے دہلی کی جن متعدد شاعروں کو اہمیت دی گئی ہے ان میں سرِفہرست غالب ہی ہیں۔[۲۶] اس کے ساتھ ساتھ غالب کے پانچ شاگردوں کو بھی ''آثار الصنادید'' میں جگہ دی گئی ہے اور ''آثار الصنادید'' اپنے دامن میں غالب کی ایک منشور فارسی تقریظ بھی رکھتی ہے۔ غالب کی یہ تقریظ ''پنج آہنگ'' (مشمولہ کلیاتِ نثر غالب) میں بھی محفوظ ہے (۲۷)۔ اس تقریظ کا تذکرہ رشید احمد صدیقی نے اپنے مضمون ''غالب اور علی گڑھ'' میں ان الفاظ سے کیا ہے۔

''اسی آثار الصنادید پر غالب نے تقریظ لکھی، اس کی اشاعت میں دلچسپی لی، خطوط لکھ کر لوگوں کو اس طرف مائل کیا، کچھ نسخے خرید کر دوستوں کو بھیجے اور کتاب کی بڑی تعریف کی ___ اور اپنے کرم فرما رجب علی ارسلو جاہ کو فارسی خط میں اس کی تعریف بھی کی''۔ (۲۸)

غالب کی شاعری اپنے اندر ایک عہد کو سمیٹے ہوئے ہے غالب نے عہد مغلیہ کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ غالب اور سرسیّد احمد خان کے درمیان ذاتی نوعیت کے یہ روابط غالب اور علی گڑھ کے سلسلے میں پسِ منظر کی حیثیت رکھتے ہیں غالب کے عقیدت مندوں دوستوں اور کرم فرماؤں کی فہرست میں ایسے نام بھی شامل ہیں جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسیّد احمد سے بھی بنتا ہے اور ظاہر ہے ان کی تعداد بے شمار ہے۔

حوالے

۱۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ''غالب سرسیّد تحریک کی پہلی آواز'' مشمولہ افکار، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۲۔

۲۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، ''غالب اور علی گڑھ'' مشمولہ احوالِ غالب از پروفیسر عتیق الدین احمد، انجمن ترقی اُردو ہند نئی دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۔

۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ''تفہیم غالب اکیسویں صدی میں'' مطبوعہ ماہِ نو، لاہور، ۱۹۹۸ء۔
۴۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ''غالب سرسید تحریک کی پہلی آواز''، ص ۱۴۔
۵۔ سید احتشام حسین، ''علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو''، علی گڑھ میگزین (خصوصی شمارہ علی گڑھ نمبر) ۵۵۔۱۹۵۴ء، ص ۱۷۔
۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۰۔۱۹۱۔
۷۔ ایضاً، ص ۱۹۲۔
۸۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔
۹۔ نیاز فتح پوری، ''شخصیت کے آئینہ میں''، رسالہ علی گڑھ میگزین (خصوصی شمارہ علی گڑھ نمبر)، ۵۵۔۱۹۵۴ء، ص ۷۵۔
۱۰۔ محسن الملک، ''سرسید احمد خان شخصیت کے آئینہ میں''، رسالہ علی گڑھ میگزین (خصوصی شمارہ علی گڑھ نمبر) ۵۵۔۱۹۵۴ء، ص ۷۹۔
۱۱۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ''غالب سرسید تحریک کی پہلی آواز''، ص ۱۲ تا ۴۱۔
۱۲۔ پروفیسر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی، ''علی گڑھ کا تاریخی پس منظر'' مشمولہ فکر و نظر علی گڑھ، سرسید نمبر اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۶۔
۱۳۔ آفاق حسین آفاق (مرتبہ) نادراتِ غالب، کراچی طبع ۱۹۴۹ء، ص ۴۵۔ اُردوئے معلیٰ طبع اول مطبوعہ جمعہ ۵/ مارچ ۱۹۶۹ء (علی گڑھ) ص ۷۰، ص ۱۲۸، ص ۶۰، ص ۹۰، ص ۱۰۷، ص ۱۱۴ تا ۱۱۶، ص ۱۵۶ نیز جہاں غالب نے بھی علی گڑھ کو (کول) لکھا ہے۔
۱۴۔ مختار الدین احمد، پروفیسر (مرتبہ) احوالِ غالب، انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، طبع دوم ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۔
۱۵۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ''غالب اور علی گڑھ''، مشمولہ افکار۔ مضمون محمد علی صدیقی مشمولہ میزان نثر (جلد پنجم) مرتبین لطیف الزماں خان، مہر الٰہی ندیم (علیگ)، دانیال کراچی، ۲۰۰۱۔
۱۶۔ کاظم علی خاں، ''غالب اور علی گڑھ'' غالب نامہ (سلور جوبلی نمبر)، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۴۳۔
۱۷۔ سرسید احمد خان، ''آثار الصنادید'' مرتبہ خلیق انجم (جلد دوم) اُردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۱۔
۱۸۔ خواجہ الطاف حسین حالی، ''حیاتِ جاوید'' ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۹، ذکرِ غالب، مالک رام، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۴۴، خطوطِ غالب کا تحقیقی مطالعہ، کتاب نگر لکھنو، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۰۔
۱۹۔ خان، سید احمد، سر، ''حیاتِ جاوید'' (جلد دوم)، ص ۵۴۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۷۴۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۲۲۔ مالک رام، ''ذکرِ غالبؔ''، ص ۱۲۵۔ کھوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات: محمد عتیق صدیقی، انجمن ترقی اُردو (ہند)، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۴ (حاشیہ نمبر ۱)

۲۴۔ رشید احمد صدیقی، ''غالبؔ اور علی گڑھ'' مشمولہ احوالِ غالبؔ از مختار الدین احمد، انجمن ترقی اُردو ہند دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۲۶۔ سر سیّد احمد خان، ''آثار الصنادید'' (مرتبہ) خلیق انجمن (جلد دوم)، اُردو اکادمی دلی، طبع ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۱۔

۲۷۔ کاظم علی خاں، ''غالبؔ اور علی گڑھ'' مشمولہ غالبؔ نما، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۳۳۶۔

۲۸۔ رشید احمد صدیقی، ''غالبؔ اور علی گڑھ'' ص ۱۹۔

کتابیات

۱۔ آفاق، آفاق حسین (مرتبہ): ''نادراتِ غالبؔ''، کراچی، ۱۹۴۹ء۔

۲۔ غالبؔ، اسد اللہ خان: ''اُردوے معلّیٰ''، طبع اوّل، علی گڑھ، ناشر کا نام ندارد، ۱۹۶۹ء۔

۳۔ حالیؔ، الطاف حسین: ''حیاتِ جاوید''، نئی دہلی، ترقی اُردو بیورو، ۱۹۹۰ء۔

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔

۵۔ سید احمد خان، سر: ''آثار الصنادید''، مرتبہ خلیق انجم، جلد دوم، دلی، اُردو اکادمی، ۱۹۹۰ء۔

۶۔ مالک رام: ''ذکرِ غالبؔ''، نئی دہلی، مکتبہ جامع لمیٹڈ دہلی، ۱۹۷۶ء۔

۷۔ لطیف الزماں خان، مہر الٰہی ندیم: میزانِ نثر (جلد پنجم)، کراچی، دانیال، ۲۰۰۱ء۔

۸۔ محمد عتیق صدیقی: ''کھوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات''، علی گڑھ، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۲ء۔

۹۔ مختار الدین احمد، پروفیسر، (مرتبہ): ''احوالِ غالبؔ''، طبع دوم، نئی دہلی، انجمن ترقی ہند، ۱۹۸۶ء۔

رسائل

۱۔ ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، مکتبہ افکار، ۱۹۸۲ء۔

۲۔ ''علی گڑھ میگزین''، خصوصی شمارہ، علی گڑھ نمبر ۵۵، ۱۹۵۴ء۔

۳۔ ماہ نامہ ''غالب نامہ''، سلور جوبلی نمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء۔

۴۔ ماہ نامہ ''ماہِ نو''، لاہور ۱۹۹۸ء۔

o ------ o